شام: انبیاء اور صحابہ کرام کی سرزمین

مولانا محمد انیس رشید صاحب

"عالم ناتمام" کے تحت اسلامی ممالک میں سے کسی ایک ملک کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جس میں اس کے ماضی، حال اور مستقبل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس بار "شام" کا تعارف ہدیۂ ناظرین ہے۔ (ادارہ)

ملک شام کا ذکر خیر کثرت سے احادیث اور سیرت کی کتابوں اور تاریخی و تہذیبی تصنیفوں، علماء کبار، اولیائے کرام، انبیاء عظام اور ملوک وفاتحین کے تذکروں اور سوانح عمریوں میں جگہ جگہ ملتا ہے، مسلمانوں کے لیے یہ ملک اس اعتبار سے اجنبی نہیں ہے، وہ اسے غایت درجہ عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس کے تذکرے سے پھڑک اٹھتے ہیں اور اس ملک کو اپنے لیے ایک مثالی ملک تصور کرتے ہیں۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ حرمین شریفین کے بعد صحابہ کرام کی اتنی بڑی تعداد کہیں آرام فرما نہیں جتنی شام میں بالعموم اور دمشق میں بالخصوص ہے، سرزمین شام میں آرام فرمانے والے صحابہ میں حضرت بلال حبشی مؤذن رسول، امین الامت حضرت ابو عبیدہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوالدرداء، حضرت سعد بن عبادۃ، حضرت ابی بن کعب، حضرت دحیہ کلبی، حضرت ابن ام مکتوم، ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ، حضرت اسماء بنت یزید، حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت ابو ثعلبہ الخشنی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کا نام تاریخ میں ملتا ہے، علماء ومحدثین میں سے ابن الصلاح، ذہبی، مزی، مؤرخین میں سے ابن خلکان، ابن عساکر، ابن کثیر، ائمہ اسلام میں سے نووی، ابن تیمیہ، ابن قیم، صوفیائے کبار میں سے ابراہیم ابن ادھم، بایزید بسطامی، شیخ محی الدین ابن عربی، مجاہدین میں سے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی اسی خاک دمشق میں آسودہ خاک ہیں رحمہم اللہ جمیعاً، مشہور تابعی ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ بھی دمشق کے مضافات میں محو استراحت ہیں، فقہائے احناف کے مشہور عالم علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ بھی اسی خاک میں آرام فرمانے والے بزرگوں میں شامل ہیں۔

شام ایک قدیم تہذیبی و ثقافتی مرکز ہے۔ اپنی زرخیزی کے باعث یہ سرزمین لٹیرے بدوؤں کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی، دوسری صدی قبل مسیح کے آغاز ہی میں ان عرب بدوؤں نے شام کے مختلف علاقوں میں کئی ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں شامی سرحدوں کی حفاظت و مدافعت کا کام غسانی سرداروں کے سپرد تھا جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے، اگرچہ شام پر غسانی سرداروں کی حکمرانی تھی تاہم یہ لوگ رومیوں کے زیر اثر تھے چونکہ اُس وقت دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک طاقت کا نام روم اور دوسری کا فارس تھا، یہی وجہ ہے کہ جب ۶۳۵ء میں اسلامی حکومت جزیرۃ العرب سے نکل کر دمشق کی دیوار تک پہنچی تو لڑائی میں شامیوں نے رومی بادشاہ کی افواج کا ساتھ دیتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھایا تھا جس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی اور شکست اس کا مقدر بنی اور بالآخر ۶۳۶ء میں

جنگ یرموک نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور وہاں کے کئی علاقے بغیر تلوار اٹھائے فتح ہوتے چلے گئے۔

شام کی فتح کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ایران کی فتح سے کم حیرت انگیز نہیں تھے، رومی یا بازنطینی حکومت دنیا کی طاقتور ترین حکومتوں میں شمار ہوتی تھی اور رومی حکمران ہرقل شاید اپنے دور کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا، اس نے چند سال پہلے ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کو مسلسل شکستیں دی تھیں لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ہرقل بھی بے بس ہو گیا، مسلمانوں کی مسلسل کامیابیوں کو دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں سے پوچھا "جب عرب تم سے تعداد، اسلحہ اور ساز و سامان، غرض ہر چیز میں کم ہیں تو پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہرتے؟" اس پر انھوں نے جواب دیا کہ "عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں، وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے، ایک دوسرے سے برابری کا سلوک کرتے ہیں، اس کے برخلاف ہمارا یہ حال ہے کہ ہم شراب پیتے ہیں بدکاری کرتے ہیں، وعدے کی پابندی نہیں کرتے، دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش و استقلال ہوتا ہے اور ہمارے کام ان خوبیوں سے خالی ہوتے ہیں۔"

یرموک کی جنگ قادسیہ کی طرح فیصلہ کن ثابت ہوئی اس میں ستر ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک رومی کام آئے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف تین ہزار مسلمان شہید ہوئے، یہ جنگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حیرت انگیز فوجی صلاحیتوں کا ثبوت ہے جو عراق کی ابتدائی فتوحات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے شام آگئے تھے اور یہاں اسلامی فوجوں کی کمان سنبھالی تھی، جب قیصر روم ہرقل کو یرموک کے میدان جنگ میں رومیوں کی شکست کی خبر ملی تو وہ نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔

موجودہ شام کا رقبہ ۱۸۵۱۸۰ مربع کلو میٹر ہے اور اس وقت وہاں کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے لگ بھگ ہے، جب کہ یہاں کی کرنسی شامی پاؤنڈ کہلاتی ہے اور یہاں کا دار الحکومت دمشق ہے، یہاں زیادہ تر عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بولی جاتیں ہیں اور نسلی اعتبار سے یہاں آباد لوگوں کا تعلق عرب، کرد اور ارمنوں سے ہے، یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب نوے فیصد ہے جبکہ باقی دس فیصد دروز، نصیری، شیعہ، عیسائی اور یہودی ہیں۔ یہاں کی شرح خواندگی ۶۵ فیصد ہے۔

بدقسمتی سے اس مبارک اور مقدس سرزمین پر ایک طویل عرصہ سے ایک منحوس سایہ آپڑا ہے جس کی باد صرصر سے یہاں کی فضا مسموم و مغموم ہے اور ایک مصنوعی اور عرب قومیت پر ایمان لائی ہوئی جماعت کا کنٹرول اس ملک پر ہے جو یہاں کے اسلامی اور دینی رنگ کے لیے ہرگز زیبا نہیں ہے، خدا کی ذات سے قوی امید ہے کہ اس کی باران رحمت کے ایک چھینٹے سے یہ جھوٹا رنگ دھل جائے گا اور ملک شام کا اصلی چہرہ صاف و شفاف اور بے نقاب ہو کر سامنے آئے گا۔

۱۸۶۴ء کے بعد شام دو ولایتوں میں بٹ گیا، حلب اور دمشق، ۱۸۸۸ء میں بیروت کو جو شام کی بڑی بندرگاہ تھی، علاحدہ ولایت بنا دیا گیا۔

ابراہیم پاشا کے زمانے سے شام کے دروازے مغرب کے ثقافتی اثرات کے لیے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد امریکی مشنریوں نے مضبوطی سے وہاں قدم جمانے شروع کر دیئے، فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کا بکثرت عربی میں ترجمہ ہونے لگا، یسوع فرقے نے بیروت میں

سینٹ جوزف یونی ورسٹی کی بنیاد رکھی، علمی ترقی کے ساتھ حفظان صحت کے وسائل بہتر ہوگئے اور معاشی ترقی ہونے لگی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ترکی پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوگیا، ترکی کے جمال پاشا نے سارے شام کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، بہت سے قوم پرور عرب رہنماؤں کو تختۂ دار پر لٹکایا، وہ نہر سویز پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا لیکن ناکام رہا اور دھیرے دھیرے انگریزوں نے بزور قوت ملک پر قبضہ کر لیا اور فرانسیسی امدادی فوج نے بھی شام کی طرف اپنے قدم جمالیے۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۰ء کو فرانسیسی فوج دمشق میں داخل ہوگئی۔ ایک معاہدہ کی رو سے شام کو ترکی سے علاحدہ کر دیا گیا، رفتہ رفتہ شامی عوام کو محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی اقتدار ترکی حکومت کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کو لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے، آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہڑتالوں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ بغاوتیں ۱۹۲۵ء کی عام بغاوتوں کا باعث بنیں، فرانسیسیوں نے ۴۸ گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کی، ان کے اس اقدام کو دنیا بھر میں غم وغصے کی نظر سے دیکھا گیا، بالآخر ایک سمجھوتہ کے تحت ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو تمام فرانسیسی فوجیں شام سے ہمیشہ کے لیے نکل گئیں۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام نے عالم عرب میں ہیجان پیدا کر دیا، عرب ممالک نے جن میں شام بھی شامل تھا اسرائیل کے خلاف ناکام پیش قدمی کی۔ اس دوران میں شام کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ اس سیاسی خلفشار کے پیش نظر یکم فروری ۱۹۵۸ء میں قاہرہ سے دونوں ممالک مصر اور شام کے اتحاد کا اعلان ہوگیا اور اس کا نام "جمہوریہ متحدہ عرب" رکھا گیا۔ جمال عبدالناصر اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا اور بالآخر ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو شامیوں اور مصریوں کا اتحاد ٹوٹ کر بکھر گیا۔

مارچ ۱۹۶۳ء میں سوشلسٹ بعث پارٹی نے فوج کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نئی حکومت نے پٹرول اور دیگر معدنیات کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

۱۹۶۶ء میں پھر فوجی انقلاب آیا جس میں بعث پارٹی کے انتہا پسند برسر اقتدار آگئے۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے جولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل حافظ الاسد شام کے صدر بنے اور نورالدین عطاشی کو معزول کر دیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں شام نے اسرائیل سے جنگ کر کے اپنا کچھ علاقہ واگزار کرا لیا جو ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر اسرائیل نے ہتھیا لیا تھا۔

۱۹۸۰ء میں شام اور لیبیا کے الحاق کا فیصلہ کیا گیا تاہم اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ۲۰۰۰ء میں حافظ الاسد کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بشار الاسد کو شام کا صدر منتخب کیا گیا۔

شام کے شمال میں ترکی، مشرق میں عراق، جنوب میں اردن اور سعودی عرب اور مغرب میں بحیرہ روم اور لبنان واقع ہیں، شام کا بیشتر حصہ ریگستانی یا نیم ریگستانی ہے۔

شام بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے، ملک کی ستر فیصد آبادی کا انحصار کھیتی باڑی پر ہے، چند سیراب ہونے والے علاقوں کو چھوڑ کر شام کی کھیتی کا دارومدار بارش پر ہے۔ شام کے کسان گرمیوں میں کپاس اور چارہ اور سردیوں میں گیہوں، جو، آلو، شکر قندی وغیرہ کی فصلیں تیار کرتے ہیں، گیہوں اور کپاس کے علاوہ تمباکو، چاول، چقندر، مونگ پھلی، دالیں، خربوزے، زیتون، انجیر، سنگترے، موسمی، انگور اور سبزیوں کی کاشت ہوتی ہے۔

شام کا دارالحکومت دمشق اس وقت دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد کشتی سے اتر کر سب سے پہلے دو بستیاں آباد فرمائیں، پہلے حران اور پھر دمشق، اس طرح طوفان نوح کے بعد سب سے پہلے حران اور دمشق آباد ہوئے، بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک غلام کا نام دمشق تھا، اس نے سب سے پہلے یہاں بستی بسائی تھی، اس لیے اس کا نام دمشق ہو گیا، بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ یہ بستی ذوالقرنین کی بسائی ہوئی ہے اور بعض نے اس کی تعمیر کو سکندر مقدونی کے ایک غلام کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان متعارض روایتوں سے حتمی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے، لیکن یہ بات شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ یہ شہر ہزاروں سال سے آباد ہے، بائبل کے عہد نامہ قدیم میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور جب سے تاریخ کی تدوین شروع ہوئی اس وقت سے اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دمشق دنیا کا سب سے پرانا شہر ہے جو اب تک آباد ہے۔

اسلام سے پہلے اس شہر پر بے شمار طاقتیں حکمرانی کرتی رہیں۔ طلوع اسلام کے وقت یہ روم کی بازنطینی سلطنت کا اہم تجارتی شہر تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فتح ہوا اور صوبہ شام کا پایہ تخت قرار پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے گورنر مقرر ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھوں نے اسے پورے عالم اسلام کا دارالخلافہ قرار دیا، چنانچہ بنوامیہ کے عہد حکومت میں تقریباً ایک صدی تک یہ اس اسلامی حکومت کا پایہ تخت رہا جس کی حدود بحر ظلمات (اٹلانٹک) سے بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔

تقریباً ایک لاکھ انبیاء کرام کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ شام ہی کو اپنا دارالجرہ قرار دیا تھا، اس لیے جن انبیاء کرام کے حالات معلوم ہیں ان میں سے بیشتر شام ہی کے علاقے میں پیدا ہوئے اور دمشق کا پہاڑ قاسیون ان کی تبلیغ ودعوت کا بہت بڑا مستقر بنا رہا۔

مسلمانوں کے ہاتھوں دمشق کی فتح کے بعد جلیل القدر صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد یہاں آکر آباد ہوئی، لہٰذا اس شہر کو انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام کا شہر کہا جائے تو بے جانہ ہوگا اور اسی بنا پر اس کے چپے چپے سے تاریخ اسلام کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں، یہ شہر سطح سمندر سے دو ہزار دو سو فٹ بلند ہے، اس لیے یہاں کا موسم اور آب وہوا نہایت خوشگوار ہے، سردی کے موسم میں برف بھی پڑ جاتی ہے اور شدید گرمی میں بھی راتیں ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوتی ہیں۔ نہر بردہ شہر کے قریب سے گزرتی ہے اور اس کے پانی سے نہ صرف شہر کے لوگ سیراب ہوتے ہیں بلکہ اس کی بنا پر علاقہ کافی سرسبز وشاداب ہو گیا ہے۔

دمشق یونی ورسٹی کا کلیۃ الشریعہ عالم عرب میں علمی اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا رہا ہے اور شاید جامعۃ الأزھر اور جامعۃ الزیتونہ کے بعد اس کی علمی شہرت سب سے زیادہ رہی، لیکن لادین حکومتوں نے یہاں کے اہل علم وفضل پر جو ستم ڈھائے ان کی بنا پر یہاں سے بڑے بڑے صاحبان علم وفضل ہجرت کر گئے اور وہ پہلا سا علمی معیار بھی باقی نہیں رہا اور علمی تدین کے اعتبار سے تو یہاں کی فضا اور بھی گر گئی، یونی ورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے لیکن اس کے باوجود متعدد طالبات مکمل برقع میں ملبوس ہوتی ہیں۔

دمشق کے علاوہ حمص، حلب، لاذقیہ، بانیاس، طرطوس وغیرہ بھی شام کے مشہور اور بڑے شہر ہیں اور اپنی دینی حمیت اور اسلامی

محبت و تعلق میں حد درجہ مشہور و ممتاز ہیں، اسی وجہ سے یہ سب شہر ایسی وحشیانہ اور ظالمانہ تباہ کاریوں کا شکار ہوئے ہیں کہ ان کا یہاں ذکر کرنا تاتاریوں کے تاریک تاریخی باب کو چھیڑنے کے مترادف ہے، خلاصہ یہ ہے کہ شام علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کا اہم ترین خطہ رہا ہے، یہاں علم اور دین کی روایات اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم اور باقی رہی ہیں، یہاں کے لوگوں کا حسن اخلاق اسلامی اخلاق کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، ان کی ہر بات میں لطافت و نزاکت اور دلکشی تھی، یہاں تک کہ استعمار کے دنوں میں بھی شام کی یہ روایات بڑی حد تک باقی رہیں، لیکن یہاں جب سے بعث پارٹی کی حکومت آئی اس نے یہاں کے دینی حلقوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، بعث پارٹی سیاسی و معاشی نظریات میں کمیونزم کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہے اور اس کی حکومت نے پورے ملک کو ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل کر کے یہاں کے نہایت مقتدر علما اور مسلمان زعماء کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو جلاوطن ہونا پڑا اور آج شام کی بہت سی اہم شخصیتیں مختلف مسلمان ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہیں، تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد حکومت کو دینی حلقوں کا صفایا کرنے کے لیے ایک دورہ سا پڑتا ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل یا بدترین اذیتوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

ان حالات میں جب کہ سالہا سال سے دینی حلقوں کے گلے گھٹے ہوئے ہیں اور معاند اسلام قوتیں پوری طاقت سے سرگرم عمل ہیں، یہاں کی عام دینی فضا کو بہت متاثر ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ اسلام ہی کا معجزہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دلوں سے ایمان کو کھرچا نہیں جاسکا، اب بھی ماشاء اللہ مسجدیں ہیں، لوگوں میں نماز، روزے ہی کا نہیں دین کی باتیں سننے اور دینی حلقوں میں بیٹھنے کا ذوق خاصا ہے، حکومت کی طرف سے عورتوں کے دوپٹے زبردستی اتارنے کی تحریک شروع کی گئی، لیکن بڑی حد تک ناکام رہی، اب بھی دمشق کی سڑکوں پر صرف دوپٹے نہیں، باقاعدہ روایتی برقعے میں خاصی بڑی تعداد میں خواتین چلتی ہیں۔

جو علما اب شام میں مقیم ہیں ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ ہو کر خالصتاً تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہیں اور ان حالات میں یہی حکمت عملی ہے جس کے ذریعے یہاں کے مسلمانوں کے دین و ایمان کا تحفظ کیا جاسکتا ہے، اگرچہ قدیم دینی مدارس سب ختم کر دیئے گئے اور باقاعدہ دینی تعلیم صرف کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے شعبہ اسلامی علوم میں حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن اول تو ان اداروں میں بعض اساتذہ بڑے متصلب اور قوی الاستعداد موجود ہیں، دوسرے مختلف علما نے اپنی مساجد میں یا گھروں پر انفرادی طور سے دینی تعلیم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے، اس لیے اسلامی علوم کا چرچا بالکلیہ ختم نہیں ہو سکا، علماء دینی موضوعات پر کتابیں بھی لکھ رہے ہیں اور وہ بڑی حد تک آزادی سے چھپ رہی ہیں۔

لہٰذا بحیثیت مجموعی حالات افسوسناک ضرور ہیں مگر مایوس کن نہیں، باطل کی زور زبردستی ایک نہ ایک دن ان شاء اللہ ختم ہو گی اور عالم اسلام کا یہ جنت نظیر حصہ ان شاء اللہ پھر سے اپنی گمشدہ آب و تاب حاصل کرے گا۔

☆☆☆